بکھرے ہوئے اوراق
رقیہ زین الدین
شعبۂ تعلیمات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نام کتاب : بکھرے ہوئے اوراق

مصنف : پروفیسر رقیہ زین الدین

کمپوزنگ : محمد انصر القاسمی 9358491961

اشاعت : ۲۰۰۸ء

مطبع : کتابیہ انٹرنیشنل، علی گڑھ

Bikhre Huey Awraq

Prof. Roqayya Zainuddin

Edition-2008

انتساب

اپنی سخن فہم والدہ

بیگم اختر خان کے نام

ترتیب

☆☆☆

پیش لفظ

پروفیسر رقیہ زین الدین کا تعلق نفسیات کے مضمون سے رہا ہے۔ فی الوقت محترمہ شعبۂ تعلیمات اے ایم یو میں چیرپرسن/صدر شعبہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ قارئین کے لیے ہی ایک خوش گوار انکشاف سے کم نہیں کہ یہ نظم کی شاعرہ بھی ہیں۔ خود کیمپس (Campus) میں کم ہی لوگ اس امر سے واقف ہوں گے۔

شامل مجموعہ 'بکھرے ہوئے اوراق'' کی کم وبیش ساری نظمیں باطنی جذبات واحساسات کی انعکاسات ہیں۔ بعض نظموں میں نہایت گہری ناسٹلجیائی (Nostalgic) تھرتھراہٹ محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس شعری فضا میں شاعر کے باطن کا خوب صورت ہیجان، جذبات کی دبی دبی ہلچل اور باطنی روح کی ناآسودگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ ناآسودگی نا امیدی نہیں بلکہ اس کے بطن سے فکر تازہ کی شاداب فضا جنم لیتی ہے۔ شاعرہ اپنے اردگرد، تبدیل شدہ نت نئے مناظر کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت پر قدرت رکھنے اور اسے تخلیقی ہنر مندی سے پیش کرنے کے فن پر قادر ہیں۔

اپنے اندرونی جذبات کو کسی قدر صراحت یا پھیلا کر پیش کرنے کا سبب ہی ہے نظم کا انتخاب۔ کیوں کہ غزل ایجاز واختصار کا فن ہے۔ یہ طویل نظمیں نہیں ہیں مگر بالکل مختصر بھی نہیں۔ ان نظموں میں کہیں یخ بستہ مناظر ہیں، کہیں کشادہ کھلی اور سانس لیتی ہوئی وسیع وعریض شاداب فضا۔

ان گوناگوں مناظر کو شاعرہ نے اپنی فکرِ رسا سے اپنے باطن کی اتھاہ گہرائیوں میں سمولیا ہے۔ نہایت کم، منتخب، خوب صورت اور نگینے کی طرح چمکتی ہوئی لفظیات کی تال پر یہ اشعار رقص کرر ہے ہیں۔ خیال کی ترسیل میں کوئی نا قابلِ فہم ابہام حائل نہیں ہوتا۔ یہ ترسیل کی کامیابی پر دال ہے۔ فکر انگیز مصرے، خارجی پیکر تراشی، احساس کی بوقلمونی اور ایک روحانیت پسندانہ خواب ناک دھندلکا اس تخلیقی جوہر کے امتیازی نشانات ہیں۔ ان نظموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ از اول تا آخر کسی بھی نظم کے مطالعہ سے فرسودگی یا کہنگی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا بلکہ نئے تازہ وشگفتہ گلِ نورس کی دمک سے نظموں کی پوری فضا منور اور عطر بیز ہے۔

پروفیسر صاحبہ کا یہ بیش قیمت شعری مجموعہ 'بکھرے ہوئے اوراق' یقیناً کلمہ ٔتحسین وآفرین کا مستحق ہے اور امید ہے کہ شعری ادب سے دلچسپی رکھنے والے اسے بنظر استحسان دیکھیں گے۔

سید امین اشرف

سابق استاد شعبہ انگریزی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۲۰۰۸ء

☆☆☆

سر حرف

بکھرے ہوئے اوراق میری زندگی کے ایک اہم دور (۱۹۷۰ء تا ۱۹۹۲ء) کے تجربات اور احساسات کا تحریری عکس ہیں۔ مجھے اردو ادب سے شغف تو بچپن ہی سے رہا، لیکن دورانِ تعلیم میرا مضمون نفسیات رہا ہے۔ لہٰذا نہ میں کوئی ادیب ہوں اور نہ شاعرہ۔ وقت اور حالات نے مجھے سخن کی طرف مجبور کر دیا میں شکر گزار ہوں ان تمام احباب کی بالخصوص طارق مرتضیٰ، موصوف احمد اور نکہت نسرین کی جنھوں نے اسے کتابی شکل دینے میں میری ہمت افزائی کی اور نیرنگئی خیالات کی یہ چھوٹی سی کاوش پائے تکمیل تک پہنچی۔ 'بکھرے ہوئے اوراق' زندگی کا ایک نفسیاتی تجزیہ ہیں اور اس کے علاوہ وہ سب کچھ جو قارئین اپنی زندگی کے پس منظر میں خود محسوس کر سکتے ہیں۔

میر صاحب کا شعر ہے

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ شاعر ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

رقیہ زین الدین

عشق کے سر گم

پھول کی پنکھڑی بکھری تھی اللہُ اللہُ
مندر، مسجد کی صدا اللہُ اللہُ
پروازِ شاہیں اللہُ اللہُ
بلبل و پپیہے کی فریاد اللہُ اللہُ

آسماں پر بکھرے سات رنگ اللہُ اللہُ
چاند سے کیسے پھوٹے نور اللہُ اللہُ
سورج کا دمکتا چہرہ اللہُ اللہُ
وقت کے بدلتے کروٹ اللہُ اللہُ

صوفی کی صدا حق اللہُ اللہُ
بہتی ندی کے دھارے اللہُ اللہُ
ہر موجِ دریا اللہُ اللہُ
عشق کے سرگم اللہُ اللہُ

☆☆☆

درد کے آئینے میں

وہ نورِ مجسم وہ نورِ ازل تا ابد
وہ عالمِ ارواح کا احمدؐ اور ہمارا محمدؐ
وہ جو عالم کے لیے رحمت بن کر آیا
سراپا خلقِ عظیم، سراپا درد آشنا
وہ جس نے سیم وزر کے بدلے
کیا زیب تن ردائے درویشی
جنگ اور سیاست جب ہوئی
سوز و گداز محمدؐ سے درکنار
گم ہوگئی تاریکیوں میں راہِ عرفان
کھوگئی روحانیت جو ہر انسان
نہ سمجھ پایا انسان اسے جنگ کے فلسفے میں
سمجھا اسے جب دیکھا درد کے آئینے میں

☆☆☆

جستجو

غم کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی میری ہستی
یوں ہی کسی سہارے کو سمجھ بیٹھی اپنی منزل
جیسے مل گئی کوئی خوشی ابدی
سفرِ حیات چلتا رہا
اور پھر وہی کشمکش
وہی بے چینی وہی اضطراب
وہی روح کی بڑھتی تشنگی
وہی منزل کی تلاش
اس جستجو سے تنگ آ گئی جب
سوچا فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر
سجالوں، سنوار ڈالوں حیات کی راہیں
وابستگی ہو نہ امیدوں سے
نہ ٹھکرائے جانے کا غم
زندگی آزاد ہو
سطحِ ذہن پر ہے ہر خوف سے عاری
مگر خوف ہے یہ تجزیہ
چھین نہ لے میرے غموں کو
کہ پھول میں بسی رنگت کی مانند
میں اور میرے غم
ان کی حلاوت ہی میری زندگی ہے
جو یہ چھن گئے تو
جوہرِ حیات چھن جائے گا

بکھرے ہوئے خواب

پھر وہ دل کے تاریک ایوانوں میں شمع جلی
پھر وقت کے ہاتھوں ٹوٹی کوئی زنجیر چھنکی
پھر وہی خیالات کا تسلسل
وہی بکھری یادوں کی جلن
وہی دور دور تک پھیلے ہوئے
خوابوں کا ہجوم
وہ آرزوؤں کا بڑھتا ہوا جال
جس سے نہ کر سکی گریز حیات
ہر موڑ پہ ایک نئی کشش
بے سود سمجھاتی ہوئی مسحتی زندگی
ہر سمت پھیلی ہوئی رعنائیوں میں
ابھرتی ہوئی کوئی مردہ صورت
ہر خواب کی آسودگیٔ تمنا
کی کوشش پیہم
ہر نغمۂ خوشی میں پنہاں
کسی غم کی پرچھائیں کا احساس
سرسبز وادیوں سے نکلی ہوئی
دھوئیں کی لکیر کا کرب
یہ سلسلۂ فریبِ امروز و فردا
کیسے سمٹ پائیں بکھرے ہوئے خواب

شہر تمنّا

آج تم نے پکارا مجھے میرے ہم نوا
لے آئی تمہاری آواز کی کشش مجھے
پھر اسی 'شہر تمنا' میں جس کی یادیں
ہیں نقش دل وجاں کی گہرائی میں
گر چاہوں تو بھلا بھی دوں میں نقش ماضی
مگر کروں کیا جو بے وفائی میری فطرت نہیں
کسی جنوں نے نکالا مجھے اس بستی سے
کروں شکوہ کیا، جو شکوہ میری عادت ہی نہیں
یوں تو معلوم ہے مجھے بھی راز زندگی
کہ ابھی میرا جنوں حد سے گزرا بھی نہیں
پھر بھی دل کی تسلی کے لیے
بتا تو دو اے میرے، ہم نشیں
کیا ان وادیوں میں ان مرغزاروں میں
اور ان پتھریلی چٹانوں میں ہیں کندہ
میرے کچھ گیت، میری کچھ یادیں
یا یونہی وقت کے بے رحم ہاتھوں نے
گلاب کی سوکھی پتیوں کے ساتھ
کر دیئے فضا میں منتشر
میرے سارے افسانے
میرے سارے گیت

☆

کشتی تھی میری موج......

گھبرا گیا کچھ اس طرح جی میرا، ویرانئ صحرا سے
سنی ہے دستک، شاید ہیں بہاروں کے سائے میرے انتظار میں
ابھر آئی ہیں خوف و ہراس کی لکیریں میرے ماتھے پہ
اے دل ذرا ٹھہر جا شاید ہیں ہمتیں کھڑی میرے انتظار میں
کشتی تھی میری موج حوادث کے حوالے
یہ کیسی صدا آئی شاید ہے ساحل میرے انتظار میں

☆☆☆

مولسری کا وہ درخت

مولسری کا ایک سایہ دار درخت تھا
جس کی شاخوں سے لپٹا میرا بچپن تھا
لال پیلے پھل اس مولسری کے
بھری تھی جن میں امرت کی دھارا
وہیں گونجا کرتی تھی موذن کی اذاں
کتنی اپنی سی لگتی تھی وہ اذاں
پھر مولسری کے اس پیڑ کے سائے میں
کچھ لوگ ابدی نیند سو گئے تھے
وہ لوگ مولسری کی طرح سایہ دار تھے
زندگی اپنی دوسروں کے لیے جیئے تھے
دیتے جب مدت بیتی ہاتھ ناتواں ہوئے
وہ بھی مسافر کسی اور منزل کے تھے
پھر مولسری کے اس پیڑ کے سایہ میں
وہ لوگ ابدی نیند سو گئے تھے
مولسری کا وہ درخت اب میرا نہ تھا
پھل بہت تھے مگر ان میں امرت نہ تھا
وہ اذانیں اب اپنے لیے نہ تھیں
سنا ہے بستی کا چہرا بدلا تھا

وہ مولسری کا درخت شاید اب بھی ہوگا
کچھ پرانی باتیں کچھ پیغام سناتا ہوگا
میرے ساقی پلا دے وہ امرت کی دھارا
بکھری ہوئی روح کو دے جام بیداری کا
دلِ پژمردہ کو کچھ تو سکوں دے
کہ مولسری کا وہ درخت اب میرا نہ تھا
مولسری کے اس پیڑ کے سائے میں
کچھ لوگ ابدی نیند سو گئے تھے
مولسری کا ایک سایہ دار درخت تھا
جس کی شاخوں سے لپٹا میرا بچپن تھا

☆☆☆

پہچان

تم سے ملنے کے بعد ایسا لگا تھا
میری روح تمہارے روپ میں آئی تھی
تمہاری آنکھوں سے نکلی ہر شعاع
میری اپنی ہی ہستی کا پرتو تھی
کون سی خلش کون سے غم کا
مداوا تلاش کروں تم میں
بات تو ایک چھوٹی سی تھی
بات صرف پہچان کی تھی
وہ انسان کی ہو یا خدا کی پہچان
کہ پہچان کی سرحد سے آگے
نہ زماں و مکاں کوئی
نہ زمیں و آسماں کا امتیاز کوئی
بہت دنوں بعد میری اپنی ہی روح
تمہارا جسم لیے مجھے نظر آئی

☆☆☆

تم نہیں نگہبانِ وطن

اے وطن کے پاسباں اے وطن کے نگہباں
اسی مٹی میں ہم پلے اسی میں ہم بڑھے
اسی سرزمیں میں ہے جاں ہماری
آن ہماری
خواب ہمارے
یہیں دفن ہیں ہمارے وہ ہاتھ
جن نے دی جہاں کو صنعت و کاریگری
یہیں بڑھی، پھیلی اور ضم ہو گئی
تہذیب ہماری، تمدن ہمارا
آرزوؤں اور تمناؤں کے تانے بانے
ہم نے اسی مٹی میں بنے
اسی مٹی کی خاطر ہم نے گنوائیں
کتنی راتیں اور کئی انمول موتی
پھر بھی بہتے ہیں ہمارے آنسو
اپنی بے بسی پہ اپنی بے سروسامانی پہ
اور کہے جاتے ہیں ہم بے وطن
یہ کہہ کر کہ ہم ہیں غدارِ وطن

پہچان

تم سے ملنے کے بعد ایسا لگا تھا
میری روح تمہارے روپ میں آئی تھی
تمہاری آنکھوں سے نکلی ہر شعاع
میری اپنی ہی ہستی کا پرتو تھی
کون سی خلش کون سے غم کا
مداوا تلاش کروں تم میں
بات تو ایک چھوٹی سی تھی
بات صرف پہچان کی تھی
وہ انسان کی ہو یا خدا کی پہچان
کہ پہچان کی سرحد سے آگے
نہ زماں و مکاں کوئی
نہ زمیں و آسماں کا امتیاز کوئی
بہت دنوں بعد میری اپنی ہی روح
تمہارا جسم لیے مجھے نظر آئی

☆☆☆

تم نہیں نگہبانِ وطن

اے وطن کے پاسباں اے وطن کے نگہباں
اسی مٹی میں ہم پلے اسی میں ہم بڑھے
اسی سرزمیں میں ہے جاں ہماری
آن ہماری
خواب ہمارے
یہیں دفن ہیں ہمارے وہ ہاتھ
جن نے دی جہاں کو صنعت و کاریگری
یہیں بڑھی، پھیلی اور ضم ہوگئی
تہذیب ہماری، تمدن ہمارا
آرزوؤں اور تمناؤں کے تانے بانے
ہم نے اسی مٹی میں بنے
اسی مٹی کی خاطر ہم نے گنوائیں
کتنی راتیں اور کئی انمول موتی
پھر بھی بہتے ہیں ہمارے آنسو
اپنی بے بسی پہ اپنی بے سروسامانی پہ
اور کئے جاتے ہیں ہم بے وطن
یہ کہہ کر کہ ہم ہیں غدارِ وطن

کیا یہی نیزے ہیں تمہاری وفاداری کے ثبوت
کیا نہیں تم میں ظلم کا دریا دھاڑیں مارتا
کتنے جذبوں کو کچلتا
کتنی زندگیوں کو روندتا

کتنے گھر اجاڑے تم نے
اور رلایا مادرِ گیتی کو
وطن کی آبرو خاک میں ملادی
اور کہتے ہو خود کو وفادارِ وطن
تم نہیں پاسبانِ وطن
تم نہیں نگہبانِ وطن

☆☆☆

الوداع

دھندلاتی ہوئی شام کے غمگیں سائے
وقتِ رخصت یہ کہتے ہیں تم سے
کل کا سورج راہ دیکھتا ہے تمہاری
بڑھتی ہوئی ہر موج ہے منتظر تمہاری
تم چاہو تو رخ پھیر دو اِن موجوں کا
تم چاہو تو بدل دو رفتارِ زمانہ
کرتا ہے تقاضہ تم سے یہ نیا وقت
بنادو اپنے آنچل کو ایک نشانِ راہ
راستے حق کے پُر خار سہی
اپنے ارادوں سے جھکادو زمانہ
تم چاہو تو ہر منزل آساں ہوجائے
تم چاہو تو بدل دو رفتارِ زمانہ
آج تم ہو اس نئے موڑ پر
لیتا ہے انگڑائی جہاں ایک نیا خواب
ایک نیا باب ہے کھلنے والا
دیکھنا نقش اس کے نہ دھندلانے پائے
تم چاہو تو ہو طلوع ایک نیا آفتاب
تم چاہو تو بدل دو رفتارِ زمانہ

☆

ہنگامۂ بازار

اجنبی میں ہوں ہر در و دیوار ہیں اجنبی میرے لیے
اس ہنگامۂ بازار میں بن گئے سب اجنبی میرے لیے

دیکھ لی ہیں میں نے تیرے ماتھے پہ ابھری شکنیں
کیسے پہچانوں کہ چہر تیرا ہے اب اجنبی میرے لیے

میری انکساری پر تیرے بدگماں دل کی ہنسی
بن نہ جائے میرا ہی ظرف اجنبی میرے لیے

اب یوں بھی نہ کر خود کو سپرد آرزوئے زمانہ
کہ بن جائیں تیری وفا کے نقش اجنبی میرے لیے

مفاد پرستی کی دنیا میں کون ہوا ہے کس کے لیے
کیا کوئی بیدار ہوا حق کی حمایت کے لیے

نہ چھیڑ اب دل کے تاروں کو رہنے دے خاموش مجھے
آنکھیں میری بھیگی بھیگی بن گئی ہیں اجنبی میرے لیے

☆☆☆

جینے کی آرزو

میں پریشان حال آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی
کہ نیکی کا ایک فرشتہ میرے پاس آ بیٹھا
دلائی جس نے مجھے نجات دردِ دنیا سے
پھر جو آنکھیں کھولیں میں نے تو دیکھا
میرے دونوں جانب اور نظروں کی حد سے پرے بھی مسیحا ہی مسیحا تھے
سوچا مقصدِ حیات اب پورا ہو گیا۔
خوف تھا مر نہ جاؤں کہیں خوشی سے
مگر کروں کیوں نہ میں جینے کی آرزو
وہ نیکی کا فرشتہ جو میرے پاس آیا تھا
دیکھتا تھا اپنی ہستی کے لیے میرا چہرہ
میں نے اسے سب کچھ دینے کی ٹھانی
بے رحم وقت نے جو اس سے چھینا تھا
اس کی معصومیت دہراتی تھی کہانی کئی پشتوں کی
جہاں کوئی معصوم روح، کسی شیطان کے پنجوں میں
زخم خوردہ بلبلاتی تھی
سوچا اس فرشتے کی مسیحائی کی خاطر
کروں کیوں نہ میں جینے کی آرزو

☆☆☆

خالق جُنبش

تھک گئی ہوں چلتے چلتے
پاؤں میں میرے اب دم نہیں
پھر بھی چل رہی ہوں
کیوں اور کیسے؟
کوئی ان جانی تلاش
راہ گزر سے بھٹکی ہوئی
کئی چہرے ابھرتے ہیں
بے چینی اضطراب اور یہ تڑپ کیسی؟
ابر و باراں کے جھونکوں نے
ہوگئی زمیں شاداب
مگر غم ہے دھبوں کا
روح و دماغ کی ایک کشمکش کا
سطح آب پر بلبلے
بنتے بگڑتے ٹوٹتے
ٹوٹ جاتے ہیں جس طرح
رشتے جسم و روح جاں کے
مگر کوئی شے
توانائی کی پیکر

مانند حدت لہو
بلبلے پھر بن جاتے ہیں
سطح زمیں کے دائرے
چھوٹے اور بڑے
ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے
زندگی پھلتی
سمٹتی، سکڑتی
چلی جاتی ہے

☆☆☆

سوکھا ہوا پتّا

وہ پتا سوکھا تھا
زندگی کے ہراس سے محروم
پھر بھی ڈال سے چپکا تھا
شاید کسی امید کے سہارے
پھر خزاں کا ایک جھونکا آیا
وہ پتا لڑکھڑایا
اور گر پڑا زمین پہ
پھر بہار کے انتظار میں شاید

☆☆☆

آدم کی گہرائی

خزاں کے جھونکوں کی مانند میرے احساسات بھی
مجھے جھلسائے جاتے ہیں
مجھ سے چھینے لیے جاتے ہیں میری خوشیاں
اور مجھے لیے جاتے ہیں نہ جانے کون سی دنیا میں

یہ دنیا؟
کھوکھلی آوازیں
کھوکھلے ذہن
کھوکھلی روحیں
میں کہاں ہوں میری ہستی کی تلاش ہے کہاں
کیا یہی ہے آدم کی گہرائی؟

☆☆☆

دیواروں کی حقیقت

میرے اردگرد دیواریں تھیں
دیواریں جو حالات نے بنائیں
معلوم تھی دیواروں کی حقیقت
ریت کے چند ذرے یکجا تھے انھیں
پھر بھی خود کو فریب دے کر
سوچا میری اپنی ہی طاقت
شاید اسے گرنے سے بچالے
مگر دیواریں کھوکھلی ہوتی گئیں
اور میں خود کو ایک کھلے آنگن میں
تیز طوفانی ہواؤں کی زد میں
محسوس کرنے بعد بھی
زندہ رہنے کی تمنا تھی

☆☆☆

ایک خواب ایک حقیقت

یہ کیسی تشنہ لبی تھی لے گئی جو ساحل کے پاس
وہ کون تھا پلا گیا مجھے مئے دردِ نشاط

پانی کے ہر قطرے پر تھی اس کی تصویر
ہر سبزہ کہہ رہا تھا یہ 'میں' ہوں

کیوں ہو تم میرے وجود سے بدظن
یہ میرے بچپن کا بسرا کوئی خواب تھا

یا میری شخصیت کا وہ روپ
جس کی ہر آنکھ تھی دیدار کی تمنائی

میں اسی کیف و سرود میں ڈوب کر
پا گئی ہستی کا راز اپنے وجود کے معنی

☆☆☆

پیمانہ کہیں چھلک نہ جائے

یہ پُر پیچ وادی یہ گھٹاٹوپ راتیں
یہ سینے میں جلتی غباروں کی بھٹی

کہیں پیامِ رحمت کہیں قہر آلودہ
تھیں معنی خیزاب کی یہ برساتیں

یہ بہکتا، مچلتا، بھٹکتا سا دِل
آزماش طلب ہیں عشق کی راہیں

پیمانہ کہیں چھلک نہ جائے امید نوازش پر
سمائے کیسے اس میں علم وعرفاں کی باتیں

☆☆☆

حالات

لمحہ لمحہ شام کی بڑھتی ہوئی خاموشی
پھر اس خاموشی میں پنہاں ایک درد
درد جو کبھی اپنا ہے اور کبھی پرایا
درد جو ایک وسیع سمندر ہے
اپنی لہروں میں زندگی کا راز سمیٹے
تلاطم میں، سکوں میں، کبھی
زندگی کی روانی میں پنہاں یہ درد
حالات کے بدلتے کروٹوں کے ساتھ
اپنی خودی کھو کر بھاگتا دوڑتا یہ انسان
حالات کے دیئے درد سمیٹے ہوئے
کبھی مدتوں بعد کسی ٹھہرے ہوئے لمحے میں
ایک احساس کہ وہ تو اس کا غیر تھا
خود وہ قید تھا حالات کی آہنی زنجروں میں
مگر اس ٹھہرے ہوئے لمحے کی تلاش مشکل تھی

☆☆☆

اجنبی

آنکھیں جو کھلیں آج تو منظر عجیب دیکھا
'قافلہ وقت' کی سمت بڑھتے ہوئے قدم تھے
بھیڑ وہی، چہرے وہی تھے
مانوس چہروں ذرا رک تو جاؤ
یہ راہ گزر تو میری تمہاری نہیں
مگر مانوس چہروں پر اجنبیت کے نشان تھے
کئی قدم رکے، رک کے پھر چلے
گویا راہ بدلنے کی کوئی تشریح سوچ کر
اسی دھارے میں بہنے لگے
اور میں زخم خوردہ، کچھ پشیماں سی
اپنے ہی احساس کے لہو میں ڈوبی ہوئی
دور کھڑی سوچتی رہی
قافلۂ وقت کا ساتھ تو دے دوں
مگر اپنے چہرے پر یہ نیا غلاف
کہیں خود کے لیے اجنبی نہ بن جاؤں

☆☆☆

اجالے کی تلاش

شاید کہ ہو کسی بے نام بستی میں اجالا
جس کی تلاش میں میری عمر کے ہو گئے ہر لمحے بوجھل
راستے کی تاریکی میں رینگتے ہوئے زہریلے کئی سانپ
اور زمانہ ایک مہیب دیو بن کر کھڑا ہے میرے سامنے
کہ جس کے جبڑوں سے کچلی جاتی ہیں انسانیت کی ہڈیاں
تاریکی کے کئی ایسے ناگ کئی ایسے مہیب زمانے
منڈلاتے ہیں میرے اِردگرد جن کے سائے
ہر کاوِش زندگی پہ لگاتے ہیں مہر
پاؤں میرے مفلوج، سانسیں اکھڑتی ہوئی
دل اور جگر نے پتھر کا لباس پہنا
پھر بھی اور ایک راستہ اپنانے کی جرأت کر لی

☆☆☆

هستی کا سُراغ

ڈھونڈنے نکلی ہوں میں اپنی ہستی کا سراغ
وشال دھرتی
اتھاہ سمندر
وسیع آکاش
کھیل رہا ہے میرا بچپن میرے سامنے
میری آنکھوں میں جلتے ہوئے
معصومیت کے دیئے
بنتے بگڑتے ہوئے
ننھے منے سے گھروندے
ڈھونڈنے نکلی ہوں میں اپنی ہستی کا سراغ
وشال دھرتی
اتھاہ سمندر
وسیع آکاش
آج پھر ریت کے ڈھیر میں میرے سامنے
میرے اوپر بھی ہیں ریت کی چھت کے سائے
سمندر کا ساحل
اور ریت کے گھروندے
سرکتی ریت

بنتی مٹتی ہوئی گھپائیں
میرا بچپن
میری جوانی
ڈھونڈنے نکلی ہوں میں اپنی ہستی کا سراغ
وشال دھرتی
اتھاہ سمندر
وسیع آکاش
کبھی ممکن، کبھی ناممکن کی صورت آکاش کے پردے
سمندر گہرا تھا
اور ناتواں میری بانہیں
فنا کا خوف تھا
لرزتے تھے قدم میرے
اور میں ایک بار پھر
اسی ریت کی دھرتی کے سینے پر چلتی ہوئی
ڈھونڈنے نکلی ہوں اپنی ہستی کا سراغ
وشال دھرتی
اتھاہ سمندر
وسیع آکاش

☆☆☆

لب کشا

شکست خوردہ اناطوفانِ حوادث سے گزرتی ہوئی
جب لب کشا ہوئی تو زمیں کانپ گئی

درندگی نے جب نقاب اوڑھا مذہبیت کا
شرمندہ تھی انسانیت خدائی بھی خمدار خوار ہوئی

ایک دن جوہوااحساس اپنی نفس پروری کا
کائنات جھک گئی ساتھ اس کے جووہ سرنگوں ہوئی

☆☆☆

روشنی کامینار

ان تاریک وادیوں سے دور
غموں کی سرحدوں سے دور
آؤ چلیں ان سب سے دور
کوئی اور رستہ تلاش کریں

غم نہ کرو جو ہیں وادیاں تاریک
آؤ تلاش کریں شعور کی تہوں میں
روشنی کا ایک مینار
وہ ایک انسانِ کامل

لٹاتا تھا جواشکوں کے گہر
مظلوموں کی آہ سن کر
جہل کی دنیا میں آیا
جوسراجِ منیر بن کر

آؤ اس انسانِ کامل
اس روشنی کے مینار تلے
آؤ غموں کے کانٹے چنتے ہوئے
کراہتے زخموں پر مرہم لگاتے چلیں
ان تاریک وادیوں سے دور
غموں کی سرحدوں سے دور
ایک نیا رستہ تلاش کریں
ایک نیا جہاں تعمیر کریں

طوفاں کے بعد ساحل پہ ہے نظارہ
لن پر جھک گئے زمیں آسماں
زمیں وفا کے پھول کھلاتی ہے
آسماں جھوم کر بلائیں لیتا ہے
یہ ساری کائنات مظہرِ وفا
مظہرِ وفا تم بھی اور میں بھی
آؤ کہ آج تجدیدِ وفا کر لیں
ایک نیا جہاں تعمیر کر لیں

☆☆☆

تیرا در ہو گا

تیرا در نہیں چوکھٹ نہیں دیار نہیں
اس جہانِ رنگ و بو میں مجھے قرار نہیں
نہیں جو تو غم نفس کے فریب بہت ہیں
آگہی، مئے عرفاں، شعورِ حیات نہیں
ستم یہ ہے دل تیرے رمز سے آشنا نہیں
بہت ہیں نالۂ وفریاد مگر رسائی نہیں
اندھیری رات بہت ہے جلاؤ کوئی چراغ
سجدہ گاہِ زمیں سے کوئی آشنائی نہیں
جو جھک گئی یہ جبیں تو چراغ ہوں گے
کاکُل گیتی پر دمکتے تارے ہوں گے
پھوٹیں گے آبشار اشکوں کی روانی سے
نالۂ وفریاد میرے آہ رسا ہوں گے
تیرا در ہو گا چوکھٹ ہوگی دیار ہوگا
اس جہانِ رنگ و بو میں قرار ہوگا

☆☆☆

وجود

اب کہاں وہ گلے نشیب وفرازِ حیات کے

آہیں مجھے ہیں عزیز، بخشتی ہیں تم سے آشنائیاں

مبتلائے حجاب ہوں، خیالِ خام میں ہوں

یہ مکاں، یہ زماں، یہ فاصلے، یہ نیرنگیاں

حدتِ عشق سے ہو نہ جائے پارہ پارہ وجود

جو آ کر تھام لو وجد میں آجائیں اداسیاں

پھیلی ہیں ہر سمت وجود میں تمہاری سانسیں

جو سمیٹ لے انھیں..........وہ میں کہاں

☆☆☆

فضا کا رنگ

آج اچانک یہ کیا ہوا فضا کا رنگ بدلا سا ہے
نسیمِ سحر نے چپکے سے کہا یہ رنگ نیا نیا سا ہے

وہ ظلمتوں کی تنہا گزاری رات سیاہ سیاہ سی
یہ کس کا پیام آیا جو آنکھوں میں رنگ چڑھا سا ہے

آسماں کا رنگ دیکھا، جگر کے لہو کا رنگ بھی دیکھا
حسرت ہے کہہ سکوں وہ 'رنگ محیط' بھی دیکھا

☆☆☆

دنیا سمیٹی نہ گئی

ایک دنیا تھی مگر ہم سے سمیٹی نہ گئی

وہ تمہارا کرم
تمہاری نوازشیں
وہ شرح صدر کی کوششیں
دو ہاتھ بڑھا کر پلایا مجھے
مگر میں وہیں کی وہیں رہ گئی

ایک دنیا تھی مگر ہم سے سمیٹی نہ گی

قلب بھی رکا رکا تھا
ذہن تھکا تھکا سا تھا
غمِ ہستی کا احساس پھر سے چھایا تھا
اور تم دور سے مجھے آواز دیتے رہے
مگر میں گنہگار
تم سے شرمسار
دم بخود تھی

ایک دنیا تھی مگر ہم سے سمیٹی نہ گئی

☆☆☆

ہست وبود

محبت فیض رحمانی
وجہ کائنات

محبت ہی بقائے زندگی
بقائے کائنات

حسد اور نفرت کی چنگاری
جھلسا گئی حسن کائنات

کراہتی ہوئی انسانیت کے زخم
کر گئے داغدار تواریخ کے اوراق

تھا جس کے سر پر خلافت کا تاج
وہ بھول گیا اپنا مقصدِ حیات

بھول کر اپنی ہستی کا راز
انساں نہیں ہے فقط راکھ

☆☆☆